سالک بلال☆

علامہ اقبالؒ صوفیاء کے حضور میں

تلخیص:

علامہ اقبال کو تصوف کے ساتھ خاص شغف تھا۔ یہ ابتداء سے ہی ان کا مرغوب اور پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ تحریرات اقبال کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ اقبال نے کئی جگہوں پر تصوف کے مخالفت میں اور مدافعت میں موقف اختیار کیا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی غلط فہمیاں در آئی ہیں۔ بعض لوگ اقبال کو تصوف کا مخالف اور بعض لوگ اقبال کو تصوف کا حامی قرار دیتے ہیں۔ اقبال دراصل اس تصوف کے مخالف تھے جس سے لوگوں کے قوائے عملی مفلوج ہو جائیں۔ اقبال اس تصوف کے حامی ہیں جس سے مراد اخلاص فی العمل سے ہو۔

لغات:

تصوف۔ صوفیاء، اشتقاق، عجمی، تصوف، کشف

بہت سارے ادب شناس حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ علامہ اقبالؒ تصوف کے مخالف تھے حالانکہ یہ تحقیق کے بالکل برعکس بات ہے۔ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی "چونکہ اقبال کے پاس جامۂ پارسائی نہ تھا اس بنا پر بہت سے حضرات جن میں اکبر الہ آبادی اور خواجہ حسن نظامی، ایسے نکتہ داں ونکتہ شناس ارباب علم وادب شامل ہیں اقبال کو تصوف کا منکر اور مخالف سمجھ بیٹھے اور اس حیثیت سے ان پر تنقید کر گئے"۔ اے میرے نزدیک اقبال علیہ الرحمۃ کی ذات سے متعلق اس خیال کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جو مروجہ تصوف میں شامل غیر اسلامی روایات جن سے ہمارے صوفیاء بالکل ناواقف تھے کی جب مخالفت کی تو اہل الظواہر نے اقبال کے ان منظوم فرمودات کو (جو اس قبیل سے تھے) کو دلیل بنا کر یہ استنباط کرنے کی کوشش کی کہ اقبالؒ تصوف اور اہلیان تصوف کا مخالف ہی نہیں بلکہ منکر تھا۔ حکیم الامت پر اس قسم کا لیبل چسپان کرنا ان کی ذات سے بڑی ناانصافی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اقبالؒ تصوف اور اہلیان تصوف کا حامی اور مداح ہی نہیں بلکہ مسلکاً ومشرباً ایک صوفی منش اور درویش صفت انسان تھے ہم لفظ تصوف کا اشتقاقی تجزیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ قارئین کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو جائے کہ تصوف اصل میں ایک ایسا لفظ ہے جو احسان وتزکیہ کا معنوی اور اصطلاحی مفہوم اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

لفظ تصوف کے اشتقاق سے متعلق قدیم زمانہ سے ان محققین میں جنہوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے بہت اختلاف رہا ہے۔ چونکہ یہ لفظ مشرق و مغرب میں تحقیق کا موضوع رہا ہے لہٰذا اس پر دونوں جانب کے علماء کی آراء اپنے مذاق و مشرب کے تحت مختلف رہی ہیں۔ اس سلسلے میں دونوں جانب کے اقوال کا تجزیہ کرنا اور پھر علمی محاکمے کے بعد اس کے صحیح مفہوم کو متعین کر کے اقبالؒ کے متصوفانہ مزاج کی ترجمانی کرنا اقبالیات کے ایک طالب علم کے لیے ضروری بنتا ہے۔ علامہ لطفی جمعہ نے اپنی کتاب ''تاریخ الفلاسفۃ الاسلام'' میں لکھا ہے کہ صوفی کا لفظ ''صوفیا'' سے مشتق ہے جو ایک یونانی کلمہ ہے، اور جس کا معنی ''حکمت الٰہی'' کے ہیں۔ صوفی وہ حکیم ہے جو حکمت الٰہی کا طالب ہوتا ہے اور اس کے حصول میں کوشاں۔ صوفی کی غایت حقیقت الحقائق کا جاننا ہوتی ہے۔ اپنی رائے کی تائید میں لطفی جمعہ کہتے ہیں کہ صوفیائے کرام نے اس علم کا ظہار اس وقت تک نہیں کیا اور نہ خود کو اس صفت سے متصف کیا۔ جب تک کہ یونان کی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں نہیں ہوا اور فلسفہ کا لفظ اس زبان میں داخل نہیں ہوا۔[۲] ابوریحان البیرونی (م ۱۰۴۸ء) اپنی تصنیف کتاب الہند میں لکھتے ہیں کہ ''تصوف کا لفظ اصل میں 'سین' سے تھا اور اس کا مادہ 'سوف' تھا جس کے معنی یونانی زبان میں ''حکمت'' کے ہیں دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا۔ چونکہ حضرات صوفیاء میں اشراقی حکماء کا انداز پایا جاتا تھا اس لیے لوگوں نے ان کو ''سوفی'' یعنی ''حکیم'' کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ ''سوفی'' ہو گیا۔[۳] یہ لفظ تصوف کی وہ اشتقاقی تحقیق ہے جس سے پورے تصوف کا انتساب یونانی فلسفہ سے کیا جاتا ہے حالانکہ اگر فی المعنی یہ تحقیق درست بھی ہو جب بھی یہ اس بات کی دلیل نہیں بنتی کہ تصوف اسلامی کی بنیاد یونانی فلسفہ پر ہے۔ کیونکہ اس پوری بحث سے اتنا ہی ثابت ہوا ہے کہ وہ صوفی نام سے اس لیے ملقب ہوئے کیونکہ ان میں اور حکمائے یونان میں ''حکمت کی باتوں کو بیان کرنے کا انداز یا طریقہ'' اتفاقاً ایک جیسا تھا۔ لہٰذا کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے بحیثیت ایک طالب علم کے ہمارے لیے اس لفظ سے متعلق اکابر صوفیاء کی رائے اور تحقیق کا جاننا ضروری بنتا ہے۔ شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ (م ۴۶۵ھ/۱۰۷۳ء) اس لفظ کے سلسلے میں اپنی شہرہ آفاق کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''لوگوں نے اس اسم کی تحقیق میں بہت سے اقوال بیان کیے ہیں، اور کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اہل تصوف کو ''صوفی'' اس لے کہتے ہیں کہ وہ ''صوف'' کا لباس پہنتا ہے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ برگزیدگی میں ''صف اول'' میں ہوتا ہے۔ اور ایک گروہ کہتا ہے کہ اس کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ''اصحاب صفہ'' رضوان اللہ علیہم کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ ایک اور گروہ کا قول ہے کہ یہ اسم لفظ ''صفا'' سے مشتق ہے اور اس طریقے کی تحقیق کے متعلق ان معانی میں ہر شخص نے لطیف اشارات بیان کیے ہیں۔ لیکن وہ سب (اشارات) لغوی تعلق کے لحاظ سے حقیقی معنی سے دور ہیں۔ پس صفائی سب امور میں محمود ہے، اور اس کی ضد کدورت ہے۔۔۔ پس چونکہ اہل تصوف نے اپنے اخلاق و معاملات کو درست کر لیا ہے اور طبیعت کی آفت سے بیزاری اختیار کر لی ہے اس لیے ان لوگوں کو صوفی کہتے ہیں۔''[۴] اس رائے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ تصوف ''صفا'' سے مشتق ہے اور صوفی وہ ہے جس نے مجاہدے اور ریاضت کے ذریعے سے قلب کی صفائی حاصل کی ہو۔ اور صفائی قلب ہی وہ چیز ہے جو اصلاح اعمال کے لیے شرط ہے۔ اس خیال کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں ''**الا و ان فی الجسد مضغة ،اذا صلحت صلح الجسد کلهٗ و اذا فسدت فسد الجسد کلهٗ ،الا وهی القلب**''[۵] (ترجمہ) ہاں! اور بے شک جسم کے اندر ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے، تو تمام جسم درست رہتا ہے، اور جب فاسد ہوتا ہے تو تمام جسم میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ علماء

بیان کرتے ہیں کہ یہ اس لفظ کی معنوی تعبیر ہے نہ کہ لغوی کیونکہ ''صفا'' سے جو لفظ مشتق ہوگا وہ ''صفوی'' ہوگا نہ کہ ''صوفی''۔ لہٰذا لغوی اعتبار سے یہ تعبیر درست نہیں ٹھہرے گی۔ اسی طرح جو حضرات بقول صاحب کشف المحجوب لفظ تصوف کو ''صف'' سے مشتق سمجھتے ہیں (اور اس طرح اس کی تعبیر یہ کرتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو بارگاہ ایزدی میں قبولیت کی پہلی صف میں ہیں) بھی لغوی اعتبار سے صحیح اشتقاق نہیں کرتے کیونکہ لفظی اعتبار سے اگر صاحب تصوف 'کو 'صف' سے مشتق سمجھا جائے تو وہ 'صفی' ہوگا نہ کہ ''صوفی''۔ لہٰذا یہ تشریح بھی معنوی اور اصطلاحی ہی ٹھہری نہ کہ لغوی۔ اسی طرح اگر بعض محققین کی تحقیق کے مطابق ''تصوف'' کا حامل یعنی صوفی اہل ''صفہ'' سے نسبت رکھتا ہے تو اس صورت میں بھی وہ ''صفی'' کہلاتا نہ کہ صوفی۔ بہر حال مذکورہ بالا تمام اشتقاقی صورتیں معنوی یا اصطلاحی ہیں نہ کہ لغوی۔ اس بارے میں جو رائے سب سے زیادہ قوی اور متفق علیہ عند المحققین نظر آتی ہے وہ یہ کہ لفظ صوفی کی نسبت لباس صوف سے ہے جیسا کہ ابو نصر عبد اللہ علی سراج الطوسی (م ۳۷۸ھ/ ۹۸۸ء) ''کتاب اللمع'' میں رقمطراز ہے کہ ''لفظ صوفی کی نسبت لباس ''صوف'' سے ہے کہ انبیاء، اولیاء اور اصفیاء کا لباس تھا۔ جس طرح حضرت عیسیٰ کے حواری کہلاتے تھے، جس کے معنی سفید لباس والوں کے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کے زمانہ میں اگر چہ یہ لفظ نہیں ملتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ صحابی سے بڑھ کر اور کوئی لفظ نہ تھا۔ یہ غلط ہے کہ اہل بغداد نے یہ لفظ اختیار کیا۔ حسن بصریؒ اور سفیان ثوریؒ کے عہد میں بھی یہ لفظ رائج تھا اور ''تاریخ مکہ'' میں محمد بن اسحاق اور دوسروں کی سند پر روایت کی گئی ہے کہ یہ لفظ عہد اسلام سے پہلے بھی رائج تھا۔''[۶] ابن خلدون (م ۷۵۰ھ/ ۱۳۴۹ء) کا بھی یہی خیال ہے کہ ''عربی لغت کے رو سے 'تصوف' کا معنی ہیں' اس نے لباس پہنا' جیسے 'قمص' کے معنی ہے' اس نے قمیص پہنی'۔ ابتداء میں صوفیاء کو ان کی صوف پوشی کی وجہ سے صوفی کہنے لگے۔''[۷] اس رائے کے ساتھ صرف مسلمان علماء ہی نہیں بلکہ مغربی مستشرقین بھی اتفاق کرتے ہیں جن میں پروفیسر نکلسن اور نولڈیکی سرفہرست ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر قاسم غنی ایرانی اپنی شہرہ آفاق کتاب ''تاریخ تصوف در اسلام'' میں تمام محققین کی تحقیق کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''تصوف کی اصل کے متعلق تمام اقوال و آراء میں سے بطور لغت اور عقل و منطق یہ قول صحیح ہے کہ 'تصوف' عربی کا لفظ ہے اور ''صوف'' سے مشتق ہے۔ اور ہماری رائے میں یہی قرین قیاس بھی ہے کیونکہ ''تصوف'' باب ''تفعل'' کے وزن پر آتا ہے لہٰذا ''صوف کے لباس پہننے کو'' تصوف کہا جانے لگا جو بعد میں اسی نام سے موسوم ہوا۔ مجھے اس پر اس لیے بھی شرح صدر ہوتا ہے کہ حضرت علامہ اشرف علی تھانویؒ جیسے محقق بھی اپنی کتاب ''التکشف'' میں مختلف دو عناوین جو کہ اس طرح ہیں'' عادت بعض بلبس صوف'' اور لباس صوف پہننے کا ثبوت'' کے تحت اسی اشتقاقی تصور سے اتفاق کرتے نظر آرہے ہیں۔[۸] علاوہ ازیں چند احادیث سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے جیسے کشف المحجوب میں ہجویریؒ نے ''علیکم بلبس الصوف تجدون حلاوۃ الایمان''[۹] یعنی تم صوف کا لباس اختیار کرو اپنے دل میں ایمان کی مٹھاس پاؤ گے۔ یا ''کان النبی ﷺ یلبس الصوف'' یعنی نبی کریم ﷺ صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔[۱۰] اور ان ہی روایات کے تتبع میں بعد میں صوف پہننا صحابہؓ اور صوفیاء رحمہ اللہ تعالیٰ کا طریق بنا۔ چنانچہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے ستر (۷۰) اصحاب کو جو جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے ''صوف'' کے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا، اور حضرت ابو بکر بھی صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔[۱۱] یہ تمام روایات بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ لفظ 'تصوف' کو 'صوف' کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔

لفظ تصوف کی اشتقاقی بحث کے بعد اب یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ''اسلامی تصوف'' یا بقول محمد مارماڈیوک پکتھال ''عربی تصوف'' کا مفہوم

کیا ہے اور اس کے کون سے عناصر نے اس کو اسلامی دنیا میں ایک ادارہ بنا دیا۔ اس سلسلے میں محمد مارماڈیوک پکتھال کا ماننا ہے کہ تصوف ایک ایسی صنف ہے ''جس کی وساطت سے انسان اس دنیا میں خدا سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ عہد جدید کے بہت سے یورپی مصنفین تو خود خدا کے وجود کو ہی محل نظر سمجھتے ہیں مسلمان ایسا نہیں سمجھتا کیونکہ خدا پر اس کا ایمان محض اس کے اعتقاد کے وجہ سے ہی نہیں، اس کے ذاتی تجربہ اور احساس پر بھی موقوف ہے اور صوفیاء (یعنی اسلامی صوفیاء) نے اس تجربے کو اس ناقدانہ صحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ علوم طبعی کا ادارہ تحقیق بھی اس سے مطمئن ہو جائے''۱۲۔ لکھتے ہیں کہ ''میں ذاتی طور پر عربی اور ترکی تصوف سے واقف ہوں۔ عجمی تصوف زیادہ مشہور ہے اور زیادہ تر اسی کا ڈھول پیٹا جاتا ہے لیکن عرب (مراد عرب صوفیاء) اس کے غالب حصے کو محض تخیل کی پرواز قرار دے کر رد کر دیں گے۔ اہل عرب کی نظر میں عجمی تصوف میں خیال کی وہ سنجیدگی، متانت اور صحت، جو اس قدر اعلیٰ مضمون کے لیے ضروری ہے نہیں پائی جاتی۔ بلا شک و شبہ عجمی صوفیوں میں سے بعض راہ راست سے منحرف ہو کر لوگوں کی گمراہی کا موجب ہوئے۔ عربی تصوف (اسلامی تصوف) نے کبھی ایسی صورتحال پیدا نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران اپنی گونا گوں ثقافت اور پرشکوہ شاعری کے باوجود غیر اسلامی تصوف کا مرکز رہا ہے۔ عجمی تخیل حقیقت کی قربانی پر لطف و سرور کا طالب ہے۔ بخلاف اس کے عربی اور ترکی دل و دماغ اور یاس کی تلخیوں کے باوجود حقیقت کے جویا ہیں، حقیقی تصوف شریعت کی روح ہے اور نیک نہاد صوفیاء نے اُس زمانے میں روح شریعت کو زندہ رکھا جب مسلمانوں کی اکثریت کو محض قانون شریعت ہی نظر آتا تھا''۔۱۳ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تصوف اسلامی کا طرہ یہ رہا ہے کہ اس ادارہ نے ہمیشہ روح شریعت کو زندہ رکھا۔ اسلامی تصوف کا کبھی شریعت سے تصادم نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ خود کہتے ہیں ''کہ علم تصوف کو قرآن اور سنت کے تابع رہنا چاہیے۔ جس شخص نے تصوف سے پہلے قرآن حفظ نہ کیا ہو (حفظ کی قید استحضار کے لیے ہے)، اور حدیث میں سند حاصل نہ کی ہو اسے دوسروں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں ہے''۱۴ ان کے نزدیک تصوف یہ ہے کہ صوفی اس طرح خدا کی معیت میں زندگی بسر کرے کہ غیر اللہ سے اسے کوئی دل بستگی باقی نہ رہے۱۵۔ لیکن یہ جب ہی ہوگا جب سالک اس راہ میں کوشش کرتا ہے۔ بقول پیر رومیؒ

اندریں راہ می تراش و می خراش

تادم آخر دمے فارغ مباش

بہر حال صوفیائے کرام نے مذکورہ بالا مفہوم کو قیل قال کے بجائے اپنے عمل سے مبرہن کیا اور اس طرح ان کی زندگیاں اسلام کا نمونہ بن گئیں۔ علامہ اقبالؒ نے چونکہ تصوف اسلامی کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا لہٰذا ان کو یہ چیز ان کے (یعنی صوفیائے اسلام کے) دربار میں بخوبی نظر آتی ہے۔ جہاں اقبال پیر رومیؒ سے استحضار خیالی کے ذریعے سے بہت سارے سوالات کا جواب دریافت کرتے ہیں وہیں وہ بہت سارے صوفیا و اتقیاء کے مزاروں پر جا کر روحانی فیض سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں جب ان کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار مبارک پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو وہاں مراقب ہوئے۔ اس دوران ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ جس کا تذکرہ وہ بال جبریل کی اس نظم میں اس طرح کرتے ہیں

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر

وہ خاک کہ زیر فلک مطلع انوار

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے

اس خاک میں پوشیدہ ہیں وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں میری بینا ہیں ولیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلہ فقر سے ہو طرۂ دستار
باقی کلہ فقر سے تھا ولولہ حق
طرّوں نے چڑھایا نشۂ خدمت سرکار

چونکہ اکبر نے دین الٰہی کا فتنہ برپا کیا تھا۔اس کے دربار میں توحید پار پار ہوگیا تھا۔اللہ تعالی نے حضرت مجددؒ کو اس فتنہ کے سد باب کے لیے بھیجا۔ انہوں نے اس کے شرکیہ خیالات اور مبتدعانہ تصورات کا شدت سے مقابلہ کیا۔کیونکہ صوفی کا نفس گرم کبھی یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی گردن کسی جہانگیر کے سامنے جھکے۔صوفی ہمیشہ سرمایہ ملت یعنی توحید خالص کا نگہبان ہوتا ہے کیونکہ خدا اس کا مطلوب ومقصود ہوتا ہے اور وہ خدا ہی میں جیتا رہتا ہے ۔چنانچہ جب اکبر بادشاہ کی وفات ہوئی تو ان کا جانشین جہانگیر تخت نشین ہوا اور اس وقت حضرت مجددؒ کی عمر شریف ۳۲ سال کی تھی۔اور فتنۂ اکبری زوروں پر تھا جس کے استیصال کے لیے جہانگیر کوئی اقدام نہیں اٹھا سکا کیونکہ اس نے اسی غیر اسلامی ماحول میں ہی پرورش پائی تھی۔اس طرح ملت اسلامیہ کا وجود خطرے میں آگیا۔حضرت مجددؒ نے اس صورتحال کا مشاہدہ کیا اور تن تنہا کھڑے ہوئے۔مخالفوں نے ان کی اصلاحی کوششوں کو جہانگیر کے سامنے بغاوت کے رنگ میں پیش کیا جس پر جہانگیر سیخ پا ہوا اور حضرتؒ کو دربار میں طلب کیا۔جب حضرتؒ دربار میں تشریف لائے تو اسلامی طریقہ کے مطابق بادشاہ سے السلام علیکم کہا۔بادشاہ نے دریافت کیا کہ آپ نے مجھے دربار شاہی کے دستور کے مطابق سجدہ تعظیمی کیوں نہیں کیا؟ حضرت نے جواب دیا کہ شریعت اسلامیہ کسی انسان کو دوسرے انسان کے سامنے سر جھکانے کی اجازت نہیں دیتی۔یہ جواب باصواب سن کر جہانگیر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔اس طرح اس باصفا صوفی نے دربار شاہی میں یہ ثابت کر کے دیا کہ صوفی کا معبود ومطلوب صرف اللہ ہوتا ہے۔ اس طرح مخلوق سے بے نیاز ہونے کا نام اقبال کی اصطلاح میں فقر (استغناعن المخلوق) ہے۔علامہؒ اسی طرح کا فقر مزار مجددؒ پر طلب کرتے ہیں۔تاہم ندائے خیالی سے علامہؒ کو

یہ جواب ملتا ہے کہ وہ فقر بند ہو چکا ہے کیونکہ اہل نظر سمجھتے ہیں کہ اب لوگ اس فقر سے دنیاوی مفادات کو حاصل کریں گے نہ کہ محبوب حقیقی تک پہنچنے کی سعی۔ اسی طرح جب حضرت اقبالؒ اپنے مرشد یعنی مولانا رومیؒ سے بال جبرئیل کی نظم ''پیر و مرید'' میں سوال کرتا ہے کہ

خاک تیرے نور سے روشن بصر

غایت آدم خبر ہے یا نظر؟

یعنی اے مرشد من انسان کو اللہ نے کس لیے پیدا کیا؟ عقل میں ترقی کر کے فلسفی بننے کے لیے یا عشق میں ترقی کر کے عارف بننے کے لیے؟ اس پر مرشد رومیؒ جواب دیتے ہیں کہ

آدمی دیداست باقی پوست است

دید آں باشد کہ دید دوست است

آدمی کی اصل نگاہ ہے باقی صرف گوشت و پوست ہے اور نگاہ بھی وہ جو دوست کو پہچانتی ہو۔ یعنی آدمی کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایسی قوت پیدا کرے کہ محبوب حقیقی کا دیدار کر سکے۔ اور یہی **ان تعبد اللہ کانک تراہ ،فان لم یکن تراہ فانہ یراک** (صحیح مسلم) یا مسند احمد کی روایت کے مطابق **ان تعمل اللہ کانک تراہ ،فان ان لم تروہ فانہ یراک** (مسند احمد) کی باطنی قوت ہے جس کو اسلامی تصوف میں درجہ احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہی وہ تصور ذات واجب الوجود ہے جو اقبالؒ کو صوفیاء کے یہاں ملتا ہے عقلی اعتبار سے خدا کو ماننا اقبالؒ کے یہاں دین عامیاں ہے جبکہ ''واصل بحق'' ہونا اقبالؒ کے یہاں دین عارفاں ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں

گفت دین عامیاں؟ گفتم شنید

گفت دین عارفاں؟ گفتم کہ دید

اسی لیے اقبال ایسی نماز کی دعوت دیتے ہیں جس میں مکمل حضوری حاصل ہو۔ فرماتے ہیں کی جہاں آپ نماز میں دوسری چیزوں کو دیکھتے ہو جیسے مصلی پاک ہے کہ نہیں، منہ قبلے کی طرف ہے کہ نہیں، وہیں یہ بھی دیکھو کہ دل اللہ کی طرف ہے کہ نہیں۔ اگر سب کچھ ہے لیکن دل اللہ کی طرف نہیں ہے تو شریعت کا ظاہری تقاضا تو پورا ہو جائے گا لیکن اس سے جو چاہا جا رہا ہے کہ آپ کا تعلق اللہ سے ہو جائے وہ فوت ہو گا۔ فرماتے ہیں

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور

ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

یہی اتصال بحق اقبال کے یہاں خودی سے موسوم ہے اور اسی قسم کی خودی یعنی مخلوق کے خیال سے دل و دماغ کو خالی کرنے اور اللہ کے خیال میں ہر وقت رہنے کی دعوت اقبالؒ دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب

ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

لہٰذا جس خودی سے ایک فرد آشنا بحق نہیں ہوتا ہے وہ اقبال کے یہاں خودی نہیں بلکہ خود پسندی ہے جبکہ تصوف کا مطمح نظر خدا پسندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اکثر محقق اقبالؒ کے ابتدائی دور کے کلام کا سرسری مطالعہ کر کے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اقبال صوفیا اور تصوف کے مخالف تھے حالانکہ آخری دور میں اقبالؒ صوفیائے اسلام کے بڑے مداح ہوئے۔ بقول آل احمد سرور ''شروع میں ان کو ''کتاب الطواسین'' میں الحاد، زندقہ نظر آیا تھا لیکن مسیوں (MASIGNON) کی تحقیق سے بہرہ مند ہونے کے بعد جاوید نامہ میں منصورؒ عشق نبوی ﷺ سے منور ایک شمع نظر آتے ہیں۔ محی الدین ابن عربیؒ کے تعلق سے انہوں نے کیا کچھ نہیں کہا تھا مگر خطبات میں ان کے استدلال سے مدد لی۔''[۱۲] کیونکہ خیر کے دور سے نکل کر جب نظر کے دائرے میں داخل ہوئے تو ابن عربیؒ کا استدلال موزوں معلوم ہوا اور اس طرح ابن عربیؒ کے اس شعر کے، صداق بنے۔

فمن شهدالامر الذی فاشهدنهٗ

یقول قولی فی جفاء و اعلان

یعنی پس جس نے اس امر کا مشاہدہ کیا جسے ہم نے مشاہدہ کیا ہے، وہ تو ہمارے ہی قول کا قائل ہوگا خفیۃً ہو یا اعلانیۃً۔ بہر حال اقبالؒ صوفیا سے تعلق جوڑنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر آپ سوز و گداز چاہتے ہو تو اس کے لیے حضرت رومیؒ جو سرخیل صوفیاء میں سے تھے کو رفیق راہ بناؤ

پیر رومی را رفیق راہ ساز

تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

☆☆☆☆☆☆

حوالے

۱۔ اقبال اور تصوف مرتبہ آل احمد سرور (ناشر) اقبال انسٹی ٹیوٹ۔ کشمیر یونیورسٹی۔ سرینگر (اگست ۱۹۸۰ء)

۲۔ اسلامی تصوف اور اقبال (از) ابوسعید نورالدین (ناشر) اقبال اکادمی لاہور طبع اول ۱۹۱۷ء

۳۔ "کتاب الہند" بحوالہ اسلامی تصوف اور اقبال صفحہ نمبر ۳۔ (از) ابوسعید نورالدین (ناشر) اقبال اکادمی لاہور طبع اول ۱۹۱۷ء

۴۔ "کشف المحجوب" بحوالہ اسلامی تصوف اور اقبال صفحہ نمبر ۳۔ (از) ابوسعید نورالدین (ناشر) اقبال اکادمی لاہور طبع اول ۱۹۱۷ء

۵۔ بخاری

۶۔ کتاب اللمع بحوالہ مجلہ اقبال بزم اقبال لاہور بابت اپریل ۱۹۵۷ء، مضمون تاریخ تصوف کا ہندی، یونانی اور اسلامی پس منظر، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفحہ ۸۷

۷۔ اسلامی تصوف اور اقبال صفحہ نمبر ۸۔ (از) ابوسعید نورالدین (ناشر) اقبال اکادمی لاہور طبع اول ۱۹۱۷ء

۸۔ التکشف عن مہمات تصوف (در رسالہ) "حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ العنیقۃ" صفحہ نمبر ۶۲۲ (از) اشرف علی تھانوی ناشر مکتبۃ الحق ماڈرن ڈیری جوگیشوری ممبئی۔

۹۔ اسلامی تصوف اور اقبال صفحہ نمبر ۱۱ (از) ابوسعید نورالدین (ناشر) اقبال اکادمی لاہور طبع اول ۱۹۱۷ء

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ اسلامی کلچر صفحہ ۸۸ تا ۸۹ (از) مارماڈیوک پکتھال (مترجم) پروفیسر محمد ایوب منیر ایڈیشن ۲۰۰۱ء ناشر اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی

۱۳۔ ایضاً صفحہ ۸۹

۱۴۔ قوت القلوب جلد دوم ص ۳۵، بحوالہ تاریخ تصوف (از) پروفیسر سلیم چشتی ناشر اریب پبلیکیشنز نئی دہلی سن طباعت ۲۰۱۳ء

۱۵۔ رسالہ قشیریہ ص ۱۲۷، بحوالہ تاریخ تصوف (از) پروفیسر سلیم چشتی (ص ۲۱۱)

۱۶۔ اقبال اور تصوف، ریختہ ڈاٹ آرگ (rekhta.org/articles/iqbal)

(تعارف) سالک بلال ادارہ راہ نجات اور ماہنامہ راہ نجات بارہمولہ جو کہ ایک تحقیقی جریدہ ہے کے نائب سرپرست ہیں۔ اس کے علاوہ مجلس علمی جموں و کشمیر جو خالصتاً ایک علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلس ہے کے شعبہ نشر و اشاعت کے سیکریٹری بھی ہیں۔ موصوف نے ابھی تک کئی کتابیں اور بہت سارے تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ موصوف نے اقبال انسٹیٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے سابقہ ڈائریکٹر محترم بشیر احمد نحوی صاحب کے تحت غیر رسمی انداز میں "اقبال اور تصور عبدیت" کے عنوان پر ایک گران قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ ڈائریکٹر موصوف نے اس کام کو اس خاص موضوع پر ایک شاہکار کام کہہ کر مصنف کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے اقبال اور تقلید کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے جس کو اقبال عالمی سوسائٹی پاکستان نے اپنی ویب سائٹ پر شائع کیا۔ موصوف کی کئی کتابیں اس وقت مسودے کی صورت میں چھپنے کی انتظار میں ہیں۔

سالک بلال (نائب سرپرست ادارہ راہ نجات بارہمولہ)

☆☆☆☆☆☆